مرزا اطہر بیگ کے ناولوں کا موضوعاتی و اسلوبیاتی مطالعہ

ڈاکٹر محمد فرید احمد

Dr. Muhammad Fareed Ahmad

Lecturer, Department of Urdu,

Govt. Municipal Degree College, Faisalabad.

عبدالعزیز ملک

Abdul Aziz Malik

Lecturer, Department of Urdu,

Govt. College University, Faisalabad.

Abstract:

"Mirza Athar Baig is a renowned Urdu novelist of the 21st century. "Ghulam Bagh" and "Sifer Say Aik Tak" are his remarkable and thought provoking novels of this era. These novels stand out with a prominent deviation from the literary style and themes of traditional novels of the age. Class distinction, social conflicts, psychological as well as practical ways of gaining power of wealth and knowledge of the upper class to snub the lower class, retaliation of the downtrodden people of society etc are the main subjects which the novelist has presented with his peculiar philosophical literary style. This article may exhort the thought and critical approach of the reader."

مرزا اطہر بیگ کا ناول ''غلام باغ'' ۲۰۰۶ء میں شائع ہوا۔ اس ناول کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مابعد جدید اور نوآبادیاتی فلسفے کے اثرات فلسفیانہ انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔ یہ ناول موضوع کے حوالے سے بھی گزشتہ کئی ناولوں سے منفرد ہے۔ ''غلام باغ'' حقیقت میں ایک علامتی مقام کی نمائندگی کرتا ہے۔ جسے کبھی ماہر آثار قدیمہ نے تلاش کیا ہوگا۔ مگر حقیقت میں ایسے کسی باغ کا وجود نظر

نہیں آتا۔ غلام باغ کا لفظ مصنف نے علامتی طور پر استعمال کیا ہے جس سے بظاہر تو یہ نظر آتا ہے کہ یہ کوئی ایسا باغ ہے جہاں پر غلاموں کو رکھا جاتا تھا۔ ''غلام باغ'' طاقت کا استعارہ ہے جس کے پس منظر میں یہ بتایا گیا ہے کہ یہاں پر ان لوگوں کو لایا جاتا جو اس وقت کے آقاؤں کے خلاف بغاوت کرتے۔ ایسے لوگوں کو سبق سکھانے کے لیے اس باغ میں ان پر تشدد کیا جاتا، تاکہ وہ ہمیشہ کے لیے غلام بن جائیں۔

اس ناول کا بنیادی کردار ''یاور عطائی'' کا ہے۔ یاور عطائی ارزل نسل سے تعلق رکھتا تھا جن کی خواتین کی سے ناروا سلوک اس لیے کیا جاتا تھا کہ یہ کمتر خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی عصمت دری کرنے والا کاچھر اور پگھل خاندان تھا اس ارذل نسل میں سے یاور عطائی پیدا ہوتا ہے جو کاچھر اور پگھل خاندان سے انتقام لینے سے کے لیے حکیم بن جاتا ہے اور ''گنجینۂ نشاط'' کے نام سے ایک نسخہ بیچتا ہے جس سے لوگ نحیف اور کمزور ہو جاتے ہیں۔ یہ سب امیر زادے یاور عطائی کے اس حوالے سے غلام نظام آتے ہیں۔ خادم حسین مرنے سے قبل اپنے بیٹے یاور حسین کو بلاتا ہے اور اسے ''گنجینۂ نشاط'' والے نسخہ سے متعلق بتاتے ہوئے اس سے پوچھتا ہے کہ یاور تم کو معلوم ہے کہ ہم کون لوگ ہیں۔ یاور حسین کے اپنے والد کو بتائے گئے الفاظ اس ناول میں موجود طبقاتی کشمکش جیسے موضوع پر یوں روشنی ڈالتے ہیں:

> ''ہم نیچ نسل کے لوگ ہیں ابا جی۔ مانگر جاتی وہ ارذل نسل ہے جو سوکڑ نہر کے کنارے تیڑیوں میں رہتی ہے۔ بلکہ یہ بھی میں نے غلط کہا، کوئی بھی کیڑا مکوڑا اپنی نسل کی رہن سہن سے نیچے نہیں رہتا۔ یہ انسانوں میں ہی ہے۔ خیر وہ جیسے رہتے ہیں آپ جانتے ہیں، سب جانتے ہیں۔۔۔''(۱)

اس ناول میں دوسرا اہم کردار ''کبیر'' کا ہے جو شہر میں اس لیے آتا ہے کہ اپنی محنت کے بل بوتے پر وہ ایک دن بڑا آدمی بن جائے گا۔ نیلے رجسٹر میں وہ بہت سی چیزوں کا اندراج کرتا رہتا ہے اور لوگوں کو بتاتا ہے کہ وہ کوئی شاہکار تخلیق کرنے جا رہا ہے۔ لوگوں کو بھی تجسس رہتا ہے کہ آخر اس نیلے رجسٹر میں کیا ہے۔ آخر کار جب اس نیلے رجسٹر کے بہت سے صفحات حادثاتی طور پر جل جاتے ہیں تو یہ حقیقت پھر بھی سامنے نہیں آ پاتی کہ کبیر کیا لکھ رہا تھا۔ یہ کردار بھی دراصل لوگوں کو مرعوب کرنا چاہتا ہے۔ یہی کردار مصنف کے اس خیال کی ترجمانی بھی کرتا ہے کہ فکشن رائٹر کے لیے لازم ہے کہ حقائق کو مربوط شکل میں پیش کرے۔ ''نیلے رجسٹر'' کے مندرجات کی ابتداء میں مصنف کا فلسفہ ان الفاظ میں سامنے آتا ہے:

> ''فکشن کے خالق کو خدا بننے کا اختیار کس نے دیا ہے۔ اس کی ہر افسانوی حرکت میں خدا بننے کا دعویٰ چھپا ہوا ہے اسے ایسا عالمِ کُل اور قادرِ مطلق بننے کا حق کس نے دیا ہے؟ وہ کسی بھی متنفس کے

شعوری حتیٰ کہ لاشعور کی گہرائیوں میں اتر کر اس کے بطون ذات
کے جملہ اسرار کی خبر لاتا ہے اور پھر زمان و مکان کی قید سے بھی ماورا
ہو کر کائنات کے کسی بھی گوشے کسی بھی واقعے کی جزئیات بیان کرتا
ہے اگر وہ کسی واحد متکلم کی ذات کو اختیار کرتا ہے تو پھر ''میں'' کی
اس کھڑکی کی راہ سے، سب کچھ دیکھ لینے کا دعویٰ کرتا ہے۔''(۲)

''غلام باغ'' میں انگریزوں کے جانے کے بعد یہاں کے لوگوں کی نفسیاتی کیفیات کی بھی عکاسی کی گئی ہے۔ انگریز تو چلا گیا مگر یہاں کے لوگ ایک عرصہ ان کی غلامی کرنے کے بعد آج بھی نفسیاتی حوالے سے کسی نہ کسی طرح اپنے آپ کو غلام سمجھتے ہیں۔ اگر غلام نہیں سمجھتے تو احساسِ کمتری کو دور کرنے کے لیے کسی نہ کسی حربے سے آقا بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کی ایک مثال یاور عطائی اور کبیر کے کرداروں سے واضح ہوتی ہے جن میں انتقامی جذبہ اور آقا بننے کی خواہش بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔

یہ ناول مابعد نوآبادیاتی سوچ اور اثرات کی بھرپور ترجمانی کرتا ہے۔ اس ناول کی تمام جزئیات انتشار کا شکار ہیں۔ اس کے کردار اس کا پلاٹ اور اسلوب کسی بھی مروجہ طریقے کی پیروی کرتا دکھائی نہیں دیتا۔ نہ تو اس ناول کا کوئی باقاعدہ آغاز ہے اور نہ اس ناول کا کوئی باقاعدہ اختتام ہے اور یہ ساری صورت حال مابعد نوآبادیاتی اثرات کی بھرپور ترجمانی کرتی ہے۔ غفور احمد ''نئی صدی نئے ناول'' میں اس ناول کی مجموعی کیفیت کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

''غلام باغ'' اپنے موضوع، اسلوب، ہیت اور کردار نگاری سبھی
حوالوں سے ایک منفرد ناول ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس ناول
میں نئی اور توانا نثر بھی پیش کی گئی ہے جو طویل جملوں کی حامل ہے
لیکن اس کے باوجود گفتگو کو بوجھل نہیں ہونے دیتی۔ سب سے بڑھ
کر اس ناول کی خاص بات یہ بھی ہے کہ یہ اُردو کے افسانوی ادب
میں اپنی نوعیت کا واحد تجربہ بھی ہے۔''(۳)

مرزا اطہر بیگ کا دوسرا ناول ''صفر سے ایک تک'' بھی مابعد نوآبادیاتی نظام کی ترجمانی کرتا ہے۔ اس میں ناول کا مرکزی کردار ''ذکی'' سائبر اسپیس کے ذریعے دنیا پر چھا جانے کی کوشش میں ہے۔ وہ اپنے خاندان اور سالار نسل کا تمام تر ڈیٹا جمع کر لیتا ہے۔ وہ اس علمی مجموعے کے حوالہ سے دنیا پر حکمرانی کے خواب دیکھتا ہے۔ وہ کمپیوٹر کے ذریعہ دنیا کو تسخیر کرنا چاہتا ہے۔ اس ناول میں وہ ''غلام باغ'' میں پیش کردہ کردار یاور عطائی سے مماثلت رکھتا ہے۔ وہ بھی ارزل نسل کا انتقام لینے کے لیے کاچھر اور پگل خاندان کو کمزور کر کے اپنا مطیع بنا لیتا ہے۔ ''صفر سے ایک تک'' میں ''ذکی'' کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کے ذریعے دنیا کو اپنا گرویدہ بنانے کی کوشش میں ہے۔

منفی نوعیت کے کرداروں کو بھی مرزا اطہر بیگ اپنے ناولوں میں پیش کرتے ہیں۔ اس ناول میں ''گامو'' جادوٹونے کے ذریعے ''ذکی'' سے قربت چاہتی ہے مگر ناکام رہتی ہے۔ وہ تعویزات کے ذریعے اپنی مرضی کے مطابق لوگوں کو اپنا گرویدہ بناتی ہے۔ اسی ناول میں جعلی پیر کا کردار بھی شامل ہے جس پر ناول نگار کڑی تنقید کرتا ہے۔ اطہر بیگ کے ناولوں میں جعلی پیروں پر اچھی خاصی تنقید پائی جاتی ہے۔ ''غلام باغ'' میں بھی ننگے افلاطون کے نام سے ایسا کردار پیش کیا گیا ہے جو لوگوں کو گالیاں دیتا ہے اور ساری عمر ننگے بدن کے ساتھ غار میں گزارتا ہے مگر لوگوں کی اس سے عقیدت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاتا ہے کہ گالیاں سن کر بھی وہ ناراض نہیں ہوتے بلکہ خوشی خوشی واپس چلے جاتے ہیں۔ اس ناول میں بھی کہانی کسی خاص فنی حوالہ سے آگے نہیں بڑھتی اور نہ مربوط نوعیت کا پلاٹ موجود ہے۔ اس کا اسلوب بھی اردو انگریزی کا ملغوبہ ہے اور خاص طور پر کمپیوٹر اور انٹرنیٹ سے متعلقہ الفاظ کی بہتات ہے۔ اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو:

> ''پھر اچانک میری توجہ افسردگی اور آفت کے درمیان ''اور'' (and) پر مرکوز ہو گئی and جو ڈیجیٹل لاجک کے تین اہم دروازوں (gates) اور (and) یا (or) اور نہیں (not) میں سے ایک ہے۔ اب افسردگی اور آفت کے درمیان وہ ایک بند طلسمی دروازہ تھا۔ جس کا کھل جا سم سم مجھے بھول چکا تھا۔''(۴)

مرزا اطہر بیگ کے دونوں ناولوں میں کہانی، اسلوب اور کردار کی پیشکش کے روایتی طریقۂ کار سے انحراف کیا گیا ہے اور مابعد نوآبادیاتی صورت حال کی عکاسی بھی کی گئی ہے۔ اس طرح اکیسویں صدی کی پہلی دہائی میں منفرد اسلوب اور موضوع کو ناول میں متعارف کرانے والے وہ پہلے ناول نگار ہیں۔ ان کا موضوع اور اسلوب مابعد جدیدیت عناصر کی جھلک پیش کرتا ہے۔ جس طرح کہانی کسی خاص ترتیب سے آگے نہیں بڑھتی اسی طرح اسلوب میں بھی خاص روانی نہیں ہے۔ فلسفیانہ عناصر کی چھاپ جابجا نظر آتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملے اور رموز واوقاف کا استعمال یہ واضح کرتا ہے کہ مصنف نے اس طرح کے اسلوب کو وضع کرنے کے لیے شعوری کوشش کی ہے۔ کبھی کبھی یہ اسلوب عام قاری کے لیے مشکل اور پیچیدہ انداز بھی اختیار کر لیتا ہے۔ یہ اسلوب پڑھے لکھے قاری کے لیے ترتیب دیا جانے والا اسلوب ہے۔ یہ عام ناولوں اور ان کی تحریروں سے مختلف ہے۔ سید عابد علی عابد اسلوب کے ایسے انداز سے متعلق اپنی رائے پیش کرتے ہیں:

> ''سادگی کلام اسلوب کی ایک صفت تو ضرور ہے لیکن بعض اوقات موضوع ایسا پیچیدہ ہو جاتا ہے کہ فن کار کو سادگی کی بجائے قطعیت یا Clarity کی صفت اسلوب کو عطا کرنا پڑتی ہے۔ جہاں اسلوب

میں قطعیت ہوتی ہے، وہاں ضروری نہیں کہ ابلاغ کا رنگ پیچیدہ نہ ہو۔ ہوسکتا ہے کہ الفاظ نسبتاً مشکل ہوں، تراکیب نئی ہوں، لیکن اس کے باوجود فن کار بہ قطع یقین وضاحت سے اپنے خیال کا اظہار و ابلاغ کر سکے۔''(۵)

خطِ فاصل اور انگریزی الفاظ کی چھاپ جا بجا دکھائی دیتی ہے۔جس کی ایک مثال ملاحظہ ہو:

''ہاف مین کے الفاظ "Aphrodisiacs" اس نے نعرہ لگایا "Aphrodiasiacs"۔۔۔میرے خدا۔۔۔کوئین آف شیبا کا باپ Aphrodisiacs بیچتا ہے۔۔۔او خدایا۔۔۔کبیر۔۔۔ کبیر۔۔۔ کچھ ہونے والا ہے۔۔۔جنم کھنڈر۔۔۔ پیلا سانپ سنہری صندوقچہ اور اب یہ Aphrodisiacs۔۔۔کبیر میں تمہیں یقین دلاتا ہوں یہاں کچھ ہونے والا ہے۔ Aphrodisiacs اور پھر ہاف مین وفورِ جذبات سے اپنی دونوں رانیں پیٹتے ہوئے قہقہے لگانے لگا۔''(۶)

اس ناول میں کہانی جس طرح آگے بڑھتی ہے اسی طرح اسلوب بھی تبدیل ہوتا دکھائی دیتا ہے۔جس طرح کا کردار پیش کیا جاتا ہے اسی طرح کا اسلوب تراشنے کی کوشش کی گئی ہے۔فلسفیانہ عناصر جہاں بھی جس کردار کے ذریعے پیش کیے جاتے ہیں وہیں پر اسلوب میں فلسفیانہ عناصر کی چھاپ تحریر پر واضح دکھائی دیتی ہے۔ جہاں پر کہانی ایک خاص ترتیب سے آگے بڑھتی ہے اور کرداروں کا تعلق معاشرے کے عام اور کم پڑھے لکھے افراد سے ہوتا ہے وہاں پر اسلوب سیدھا اور سادا بھی ہوتا ہے۔ یاور عطائی کا والد خادم حسین اُسے اس کتاب کے بارے میں بتا رہا ہے جو اسے ڈاک میں سے ملی تھی وہاں پر تمام جملوں میں ایک مکمل ربط ہے اور الفاظ پر بھی فلسفے کے اثرات کم ہیں:

''تو بیٹا میں نے وہ ساری کتاب دیکھی۔ وہ ساری زبانیں تو مجھے خاک سمجھ آتیں لیکن فارسی زبان میں موٹا سارا کتاب کا نام کسی نے کتابت کر کے لکھا تھا اور جس بارے میں وہ کتاب تھی وہ مجھے سمجھ آ گیا۔ وہ وہی نسخے تھے، وہی مرد کی طاقت بڑھانے والے اور اسے جلد بوڑھا نہ ہونے دینے والے۔۔۔''(۷)

''غلام باغ'' میں پیش کردہ تمام کرداروں کی نفسیات کا بھی پتا اسی اسلوب سے چلتا ہے۔ اطہر بیگ کے یہاں عام جملوں کا اسلوب بھی یوں محسوس ہوتا ہے کہ بڑی محنت کی گئی ہے۔ ان کا اسلوب بعض اوقات داستانوی عناصر کی بھی تصویر کشی کرتا ہے۔ یاور عطائی کی وفات کے بعد جب زہرہ

اور کبیر ان مرتبانوں کو دیکھتے ہیں تو ان کی پیشکش میں مصنف نے ایک صفحے کے لگ بھگ ایسے الفاظ سکتہ کی علامت لگا کر پیش کیے ہیں کہ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے پر تکلفانہ اندازِ تحریر کا ایک خاکہ ہمارے سامنے رکھ دیا گیا ہو۔ بہر حال فنتاسی کے باوجود مصنف اپنی بات سمجھانے میں کامیاب ضرور ہو جاتا ہے:

''مجھے ہر مرتبان میں نظر آ رہے ہیں چھوٹے، بڑے، سکڑے ہوئے، ٹیڑھے، سیدھے، ہارے ہوئے، تھکے ہوئے، تنومند، بے تاب، بے صبرے، شرمیلے، شریف، بااخلاق غصیلے، عاجز، انتہا پسند، معاملہ فہم، صابر، قناعت پسند، لاغر، نیلے، پیلے، کالے، سفید، مفکر، آزردہ، خوش طبع، جلد باز، جامد، متحرک، منفرد، خاندانی، رذیل، کم ذات، اصلی، نقلی، محبِ وطن، غدار، سیاسی، فوجی، علمی، ادبی، قومی، صوبائی، عوامی، جمہوری، دردمند، بے درد، ترقی پسند، دور اندیش، کوتاہ اندیش، دانشور، علیحدگی پسند، وحدت پسند، اپنے، بیگانے، انجانے، جانے پہچانے، جھوٹے، دوغلے، منافق، عیار، مکار۔۔۔''(۸)

یوں محسوس ہوتا ہے کہ مصنف کو زبان بیان پر عبور حاصل ہے کیونکہ مذکورہ پیراگراف ابھی ختم نہیں ہوا۔ وہ الفاظ کرداروں کی نفسیاتی اور ظاہری کیفیات کا تاثر ابھارنے کے لیے استعمال کرتے ہی چلے جاتے ہیں۔ اس ناول میں جا بجا تحریر کو پُر تاثیر بنانے کے لیے قوسین، سکتہ اور حذف کی علامات کو پیش کر کے مصنف اس ناول سے متعلقہ ہر وہ بات، جو وہ سمجھانا چاہتا ہے، اس میں کامیاب دکھائی دیتا ہے۔ اسی طرح کا اندازِ بیان اور طریقۂ تحریر دورِ جدید کے لکھنے والوں میں اکثر دکھائی دیتا ہے مگر دوسرے ناول نگاروں سے مرزا اطہر بیگ کا اسلوب اس لیے بھی مختلف ہے کہ انہوں نے مکمل طور پر ایک تخیلاتی کہانی کو اپنے اسلوب کے ذریعے ہی حقیقت سے قریب تر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یاور عطائی کے شیشے کے مرتبانوں میں پڑی ہوئی چیزوں کا اندازہ لگا کر کبیر کا حواس باختہ ہو جانا کبیر کی نفسیاتی کشمکش کی عکاسی بھی کرتا ہے۔ جب زہرہ اس سے پوچھتی ہے:

''(زہرہ کی آنکھوں میں میرے لیے تشویش ہے۔ وہ خوامخواہ میرا ماتھا چھوتی ہے۔ گویا کہ ہذیاتی دورے کے ساتھ بخار کا ہونا بھی امکانی ہے۔ میں ہنس پڑا۔)

میں۔''میں ٹھیک ہوں۔ کیا دیکھ رہی ہو۔''

زہرہ۔ ''میں دیکھ رہی ہوں کہ۔۔۔ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔۔۔ کچھ۔۔۔''

میں۔ ''کچھ نہیں۔۔۔کچھ۔۔۔مدد علی۔۔۔''
زہرہ۔ ''یہ مدد علی کا ذکر اچانک۔۔۔تم کہاں سے لے آئے۔۔۔''
میں۔ ''ویسے ہی۔۔۔پتہ نہیں۔۔۔''
زہرہ۔ ''چلو واپس چلیں۔۔۔''
میں۔ ''نہیں۔۔۔نہیں''
زہرہ۔ ''ہم پھر کبھی آ سکتے ہیں۔''
میں۔ ''نہیں۔ ابھی واپسی۔۔۔نہیں ہو سکتی۔۔۔ میں بالکل ٹھیک۔۔۔''
(میں کمرے میں چاروں طرف شیشے کے مرتبانوں کی طرف اشارہ کرتا ہوں) یہ ایک دیوانے ذہن کی دنیا ہے۔۔۔''(۹)

مرزا اطہر بیگ کے ناول ''صفر سے ایک تک'' کا اسلوب دیکھا جائے تو یہ بھی ایک پڑھے لکھے ادیب کا پڑھے لکھے قاری کے لیے تراشا گیا اسلوب ہے۔ اس ناول میں جا بجا کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کے علاوہ سافٹ ویئر اور ہارڈ ویئر سے متعلقہ الفاظ تحریر کا حصہ ہیں۔ ایک وجہ تو یہ ہے کہ موضوع ہی اس نوعیت کا ہے اور دوسری وجہ یہ کہ جب کردار ہی کمپیوٹر سے متعلقہ دنیا کی پیشکش کے لیے آیا ہے تو اس کے منہ سے نکلنے والے الفاظ بھی کمپیوٹر کی دنیا سے متعلق ہی آئیں گے۔ مرزا اطہر بیگ نے ہر طرح کے کردار کی زبان کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے، یوں لگتا ہے کہ وہ اسلوب کو اہمیت دیتے ہوئے بھی اس کو اس قدر سر پر سوار نہیں کرتے کہ کسی بات کو زیادہ دیر تک سوچنے کے لیے چھوڑ دیں۔ ان کی نظر میں کہانی اہم ہے۔ وہ کہانی جو کسی منطقی صورت میں آگے بڑھتی دکھائی نہیں دیتی۔ ان کے ناول ''صفر سے ایک تک'' میں کمپیوٹر کی اصطلاحات ان کے اسلوب پر حاوی ہیں:

''پھر میں ان دو لفظوں کو جو ظاہر ہے اب کسی طرح بھی محض لفظ نہیں تھے Power Point میں لے گیا اور گہری نیلگوں خلا میں معدوم نقطے (Vanishing Points) سے نکل کر انہیں آہستہ آہستہ اپنی طرف بڑھتے دیکھتا رہا۔''(۱۰)

اطہر بیگ کے اس ناول میں بھی انگریزی، پنجابی اور اُردو کے الفاظ کے ملا کر ایک اسلوب پیدا کیا گیا ہے۔ انگریزی الفاظ کے ساتھ پنجابی کے الفاظ بھی متعلقہ کردار کی ذات کی عکاسی کرتے نظر آتے ہیں۔ ناول کے تمام کردار اپنے اپنے سماجی اور تعلیمی پس منظر کی عکاسی کرتے نظر آتے ہیں۔ مصنف نے کہیں تو انگریزی اور پنجابی زبان کے ساتھ اردو سے متبادل عبارت اور الفاظ درج کر دیے ہیں اور کہیں متبادل الفاظ کے بغیر ہی انگریزی اور پنجابی کے لفظ تحریر کے تسلسل کا حصہ بنا دیے ہیں۔

مصنف بے جا پیر پرستی کے خلاف ہے اور اپنے ناولوں میں ایسے پیر کا کردار تخلیق کرنے کے بعد اس کی ذات پر تنقید کرتا دکھائی دیتا ہے۔ تمام کرداروں کے بات کرنے کا انداز بھی جدا جدا نظر آتا ہے:

''اور پھر گاموکی آواز سنائی دی جو اس کی تیز سرگوشی والی آواز سے قطعاً مختلف تھی اور اس کو سنتے ہی میرے جسم میں خوف کی لہر دوڑ گئی کیونکہ وہ آواز کسی بین کرتی عورت کی آواز تھی۔

''پیرا تو مینوں ککھوں ہولا کر دِتا اے۔۔۔ ہن نِکے بھرا دی واری آئی اے تے۔۔۔'' وہ یہی فقرہ بار بار دہراتی تھی۔ مگر دوسرے فقرے کو مکمل نہیں کرتی تھی۔''(۱۱)

اطہر بیگ اپنے ناولوں میں اختصار نویسی کے فن کو بروئے کار لاتے ہوئے ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں جو بہت زیادہ تفصیل کو اپنے اندر سمیٹ لیتے ہیں۔ یاور عطائی جن لوگوں کو جنسی ادویات دیتا ہے ان میں سے اس نے ہر ایک کا نام ایک جملے کی صورت میں تحریر کیا ہوا ہے اور ہر ایک سے متعلق لکھا ہوا جملہ مرتبان میں ڈالتا جاتا ہے۔ جب کبیر آخر پر اس کی موت کے بعد اس شیشے والے مرتبان کو دیکھتا ہے تو پھر مصنف کی اختصار نویسی پڑھنے والے کو متاثر کرتی ہے۔ غلام باغ میں کبیر مہدی کے نیلے رجسٹر کے مندرجات بھی اسی نوعیت کی خوبیاں اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہیں۔ چوہدری الیاس پگل کے بارے میں یاور عطائی نے ایک جملہ بولا تھا اور اسے لکھ کر رکھا تھا۔ وہ تھا ''ایک بادشاہ تھا جو ملکہ اور رنڈی کے بیچ مارا گیا۔'' اس جملے میں بہت سی وضاحت طلب باتیں سمو دی گئی ہیں۔ بادشاہ کا لفظ چودھری کے لیے استعمال ہوا ہے، ملکہ اس کی بیوی کے لیے اور رنڈی دوسری عورتوں کے لیے کیونکہ چودھری الیاس پگل عیاش آدمی تھا۔ اس کی بیوی اُس کی اِس خصلت سے ہمیشہ نالاں رہتی ہے اور کوئی بھی نسوانی کردار اس سے آسودگی حاصل نہیں کر پاتا۔ ''غلام باغ'' اور ''صفر سے ایک تک'' تک میں خود کلامی کی تکنیک کا بھی استعمال کیا گیا ہے۔ یہ طریقہ کردار کی اندرونی کیفیات کی بھرپور ترجمانی کرتا ہے۔ بانو قدسیہ نے ''راجہ گدھ''، ''مستنصر حسین تارڑ نے ''قربتِ مرگ میں محبت'' اور حسن منظر نے ''العاصفہ'' میں خود کلامی کے اسی فن سے اپنے اسلوب کو مزین کیا ہے۔ مرزا اطہر بیگ کا اسلوب حالات، وقت اور تقاضوں کے تحت اپنے پیشرو ناول نگاروں سے مختلف ہے جو کہ ایک حوالہ سے انفرادیت بھی ہے۔ ڈاکٹر طاہرہ اقبال اسلوب کی اس خصوصیت سے متعلق لکھتی ہیں:

''اسلوب جہاں وقت کی ضرورتوں اور بدلتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دیتا ہے وہیں فنکار کے تخیل اور پروازِ خیال کو بھی اک جامع اور ٹھوس شکل عطا کرتا ہے اور مروجہ پیمانوں میں جہاں تبدیلی کی ضرورت ہوتی ہے یا خیال میں تبدیلی کی مانگ کرتا ہے۔ وہ ضروری

تبدیلیاں ہوتی چلی جاتی ہیں۔مختصر یہ کہ اسلوب ایک تغیر پذیر عمل
ہے جو خارجی حالات اور داخلی اپج کا مرہونِ منت ہے۔''(۱۲)

اردو ناول کے اسلوبیاتی اور موضوعاتی مطالعہ کے تناظر میں مرزا اطہر بیگ کا نام اکیسویں صدی کے ناول نگاروں میں بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ انہوں نے ''صفر سے ایک تک''، اور اپنے معروف ناول ''غلام باغ'' میں فلسفیانہ مباحث، طبقاتی کشمکش، ارزل اور اشرف کی تفریق اور اس سے پیدا ہونے والے معاشرتی انتشار اور جنسی ونفسیاتی مسائل کو اپنے منفرد اسلوب کے ذریعے اردو ناول کا موضوع بنایا ہے۔ روبینہ سلطان ''غلام باغ'' کی موضوعاتی وسعت سے متعلق یوں رقمطراز ہیں:

''غلام باغ'' کی آئیڈیالوجی اور تھیم کو اگر وسیع پیمانے پر دیکھیں تو
یہ اپنے اندر ایک فلسفہ رکھتا ہے لیکن ہر فلسفہ اور آئیڈیالوجی بیانیے
میں اس طرح گندھی ہوتی ہے کہ اس کو ناول سے الگ کرنا مشکل
ہے کیوں کہ ناول نگار نے ناول میں کسی قسم کا دعویٰ نہیں کیا اور نہ ہی
اپنی آئیڈیالوجی کو قاری پر تھوپنے کی کوشش کی ہے۔''(۱۳)

''غلام باغ'' اور ''صفر سے ایک تک'' بجا طور پر اہم ناول ہیں۔ موضوع کی انفرادیت اور انوکھے اسلوب نے عصرِ حال کے ناول نگاروں میں مرزا اطہر بیگ کو ممتاز منصب پر فائز کر دیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ اطہر بیگ، مرزا، غلام باغ، لاہور: سانجھ پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ئ، ص:۱۷
۲۔ ایضاً، ص:۳۹۰
۳۔ غفور احمد، نئی صدی نئے ناول، کراچی: کتاب سرائے، ۲۰۱۴ئ، ص:۱۰۳
۴۔ اطہر بیگ، مرزا، صفر سے ایک تک، لاہور: سانجھ پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء، ص:۳۰۶
۵۔ عابد علی عابد، سید، اسلوب، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ئ، ص:۳۰
۶۔ اطہر بیگ، مرزا، غلام باغ، ص:۲۲۷
۷۔ ایضاً، ص:۸۱
۸۔ ایضاً، ص:۴۷۰
۹۔ ایضاً، ص:۴۷۱
۱۰۔ اطہر بیگ، مرزا، صفر سے ایک تک، ص:۳۰۶
۱۱۔ ایضاً، ص:۳۰۸
۱۲۔ طاہرہ اقبال، منٹو کا اسلوب، لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۲ئ، ص:۲۰
۱۳۔ روبینہ سلطان، تین نئے ناول نگار، لاہور: دستاویز، ۲۰۱۲ئ، ص:۱۸۱